© rasailojaraid.com

تفہیم القرآن

ص

(۲)

اے نبی، صبر کرو اُن باتوں پر جو یہ لوگ بناتے ہیں[۱۶]، اور ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو[۱۷] جو بڑی قوتوں کا مالک تھا[۱۸]۔ ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرنے

---

۱۶ اشارہ ہے کفارِ مکہ کی اُن باتوں کی طرف جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق ان کی یہ بکواس کہ یہ شخص ساحر اور کذاب ہے، اور ان کا یہ اعتراض کہ اللہ میاں کے پاس رسول بنانے کے لیے کیا بس یہی ایک شخص رہ گیا تھا، اور یہ الزام کہ اس دعوتِ توحید سے اس شخص کا مقصد کوئی مذہبی تبلیغ نہیں ہے بلکہ اس کی نیت کچھ اور ہی ہے۔

۱۷ اس فقرے کا دوسرا ترجمہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ "ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو"۔ پہلے ترجمے کے لحاظ سے مطلب یہ ہے کہ اس قصے میں ان لوگوں کے لیے ایک سبق ہے۔ اور دوسرے ترجمے کے لحاظ سے مراد یہ ہے کہ اس قصے کی یاد خود تمہیں صبر کرنے میں مدد دے گی۔ چونکہ یہ قصہ بیان کرنے سے دونوں ہی باتیں مقصود ہیں، اس لیے الفاظ ایسے استعمال کیے گئے ہیں جو دونوں مفہوموں پر دلالت کرتے ہیں (حضرت داؤد کے قصے کی تفصیلات اس سے پہلے حسبِ ذیل مقامات پر گزر چکی ہیں: تفہیم القرآن جلد اوّل، صفحہ ۱۹۱۔ جلد دوم صفحات ۵۹۷ و ۶۲۴۔ جلد سوم، صفحات ۱۷۲ تا ۱۷۶ و ۵۶۰۔ ۵۶۱۔ اور حواشی سورہ سبا آیات ۱۰۔ ۱۱)

۱۸ اصل الفاظ ہیں ذَاالْاَیْد، "ہاتھوں والا"۔ ہاتھ کا لفظ صرف عربی زبان ہی میں نہیں دوسری زبانوں میں بھی، قوت، و قدرت کے لیے استعارے کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ حضرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈالا تھا۔ ہم نے پہاڑوں کو اس کے ساتھ مسخر کر رکھا تھا کہ صبح و شام وہ اس کے ساتھ تسبیح کرتے تھے۔ پرندے سمٹ آتے اور سب کے سب اس کی تسبیح کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔[۱۹] ہم نے اس کی سلطنت مضبوط کر دی تھی، اس کو حکمت عطا کی تھی اور فیصلہ کن بات کہنے کی صلاحیت بخشی تھی۔[۲۰] پھر تمہیں کچھ خبر پہنچی ہے اُن مقدمے والوں کی جو دیوار چڑھ کر

داؤد کے لیے جب ان کی صفت کے طور پر یہ فرمایا گیا کہ وہ "ہاتھوں والے" تھے تو اس کا مطلب لازماً یہی ہو گا کہ وہ بڑی قوتوں کے مالک تھے۔ ان قوتوں سے بہت سی قوتیں مراد ہو سکتی ہیں مثلاً جسمانی طاقت، جس کا مظاہرہ انہوں نے جالوت سے جنگ کے موقع پر کیا تھا۔ فوجی اور سیاسی طاقت، جس سے انہوں نے گرد و پیش کی مشرک قوموں کو شکست دے کر ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم کر دی تھی۔ اخلاقی طاقت، جس کی بدولت انہوں نے بادشاہی میں فقیری کی اور ہمیشہ اللہ سے ڈرتے اور اس کے حدود کی پابندی کرتے رہے۔ اور عبادت کی طاقت، جس کا حال یہ تھا کہ حکومت و فرمانروائی اور جہاد فی سبیل اللہ کی مصروفیتوں کے باوجود، صحیحین کی روایت کے مطابق، وہ ہمیشہ ایک دن بیچ روزہ رکھتے تھے اور روزانہ ایک تہائی رات نماز میں گزارتے تھے۔ امام بخاریؒ نے اپنی تاریخ میں حضرت ابو الدرداءؓ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت داؤدؑ کا ذکر آتا تھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کَانَ اَعْبَدَ الْبَشَرِ "وہ سب سے زیادہ عبادت گزار آدمی تھے"۔

۱۹؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن جلد سوم، صفحات ۱۷۴-۱۷۵

۲۰؎ یعنی آن کا کلام اُلجھا ہوا نہ ہوتا تھا کہ ساری تقریر سُن کر بھی آدمی نہ سمجھ سکے کہ کہنا کیا چاہتے ہیں، بلکہ وہ جس معاملہ پر بھی گفتگو کرتے، اس کے تمام بنیادی نکات کو منقح کر کے رکھ دیتے۔ اور اصل فیصلہ طلب مسئلے کو ٹھیک ٹھیک متعین کر کے اس کا بالکل دو ٹوک جواب دے دیتے تھے۔ یہ بات کسی شخص کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک وہ عقل و فہم اور قادر الکلامی کے اعلیٰ مرتبہ پر پہنچا ہوا نہ ہو۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اُس کے بالاخانے میں گھس آتے تھے[۲۱]؟ جب وہ داؤد کے پاس پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر گھبرا گیا[۲۲]۔ انہوں نے کہا "ڈریئے نہیں، ہم دو فریقِ مقدمہ ہیں جن میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔ آپ ہمارے درمیان ٹھیک ٹھیک حق کے ساتھ فیصلہ کر دیجیے، بے انصافی نہ کیجیے اور ہمیں راہِ راست بتائیے۔ یہ میرا بھائی ہے[۲۳]، اس کے پاس ننانوے دُنبیاں ہیں اور میرے پاس صرف ایک ہی دُنبی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہ ایک دُنبی بھی میرے حوالے کر دے اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا[۲۴]"۔ داؤد نے جواب دیا: "اس شخص نے اپنی دُنبیوں کے ساتھ تیری دُنبی بھی ملا لینے کا مطالبہ کر کے یقیناً تجھ پر ظلم کیا[۲۵] اور واقعہ یہ ہے کہ شرکاء اکثر ایک دوسرے پر زیادتیاں کرتے رہتے ہیں، بس وہی لوگ اس سے بچے ہوئے ہیں جو ایمان رکھتے اور عملِ صالح کرتے ہیں، اور

۲۱؎ حضرت داؤد کا ذکر جس غرض کے لیے اس مقام پر کیا گیا ہے اس سے مقصود دراصل یہی قصہ سنانا ہے جو یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے پہلے اُن کی جو صفاتِ عالیہ بطورِ تمہید بیان کی گئی ہیں ان کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ داؤد علیہ السلام، جن کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے، کس مرتبے کے انسان تھے۔

۲۲؎ گھبرانے کی وجہ یہ تھی کہ دو آدمی فرمانروا کے وقت کے پاس اُس کی خلوت گاہ میں سیدھے راستے سے جانے کے بجائے یکایک دیوار چڑھ کر جا پہنچے تھے۔

۲۳؎ بھائی سے مراد حقیقی بھائی نہیں بلکہ دینی اور قومی بھائی ہے۔

۲۴؎ آگے کی بات سمجھنے کے لیے یہ بات نگاہ میں رہنی ضروری ہے کہ استغاثہ کا یہ فریق یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ اس شخص نے میری وہ ایک دُنبی چھین لی اور اپنی دُنبیوں میں ملا لی، بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مجھ سے میری دُنبی مانگ رہا ہے، اور اس نے گفتگو میں مجھے دبا لیا ہے، کیونکہ یہ بڑی شخصیت کا آدمی ہے اور میں ایک غریب آدمی ہوں، میں اپنے اندر اتنی سکت نہیں پاتا کہ اس کا مطالبہ رد کر دوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایسے لوگ کم ہی ہیں" (یہ بات کہتے کہتے) داؤد سمجھ گیا کہ یہ تو ہم نے دراصل اس کی آزمائش کی ہے، چنانچہ اس نے اپنے رب سے معافی مانگی اور سجدے میں گر گیا اور رجوع کر لیا۔[۲۶] تب ہم نے اس کا وہ قصور معاف کیا اور یقیناً ہمارے ہاں اس کے

۲۵؎ یہاں کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ حضرت داؤد نے ایک ہی فریق کی بات سُن کر اپنا فیصلہ کیسے دے دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ جب مدعی کی شکایت پر مدعا علیہ خاموش رہا اور اس کی تردید میں کچھ نہ بولا تو یہ خود ہی اس کے اقرار کا ہم معنی تھا۔ اس بنا پر حضرت داؤد نے یہ رائے قائم کی کہ واقعہ وہی کچھ ہے جو مدعی بیان کر رہا ہے۔

۲۶؎ اس امر میں اختلاف ہے کہ اس مقام پر سجدۂ تلاوت واجب ہے یا نہیں۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ یہاں سجدہ واجب نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک نبی کی توبہ ہے۔ اور امام ابو حنیفہ وجوب کے قائل ہیں۔ اس سلسلے میں ابن عباس سے تین روایتیں محدثین نے نقل کی ہیں۔ عِکرمہ کی روایت یہ ہے کہ ابن عباس نے فرمایا "یہ اُن آیات میں سے نہیں ہے جن پر سجدہ لازم ہے مگر میں نے اس مقام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرتے دیکھا ہے" (بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، مُسند احمد)۔ دوسری روایت جو ان سے سعید بن جُبیر نے نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں کہ "سورۂ ص میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا اور فرمایا: داؤد علیہ السلام نے توبہ کے طور پر سجدہ کیا تھا اور ہم شکر کے طور پر سجدہ کرتے ہیں"، یعنی اس بات پر کہ ان کی توبہ قبول ہوئی (نسائی)۔ تیسری روایت جو مجاہد نے ان سے نقل کی ہے اس میں وہ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ "یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے راہِ راست دکھائی تھی، لہٰذا تم ان کے طریقے کی پیروی کرو"۔ اب چونکہ حضرت داؤد بھی ایک نبی تھے اور انہوں نے اس موقع پر سجدہ کیا تھا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے اقتدا میں یہاں سجدہ فرمایا (بخاری)۔ یہ تین بیانات تو حضرت ابن عباس کے ہیں۔ اور حضرت ابوسعید خُدری کا بیان یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ خطبہ میں سورۂ ص پڑھی اور جب آپ اس آیت پر پہنچے تو آپ نے منبر پر سے اُتر کر سجدہ کیا اور آپ کے ساتھ سب حاضرین نے بھی کیا۔ پھر ایک دوسرے موقع پر اسی طرح آپ نے یہی سورہ پڑھی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے تقرّب کا مقام اور بہتر انجام ہے۲۷۔ (ہم نے اس سے کہا) "اے داؤد، ہم نے

تو اس آیت کو سنتے ہی لوگ سجدہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ حضورؐ نے فرمایا "یہ ایک نبی کی توبہ ہے، مگر میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ سجدے کے لیے تیار ہو گئے ہو"۔ یہ فرما کر آپ منبر سے اترے اور سجدہ کیا اور سب حاضرین نے بھی کیا (ابو داؤد)۔ ان روایات سے اگرچہ وجوبِ سجدہ کی قطعی دلیل تو نہیں ملتی لیکن کم از کم اتنی بات تو ضرور ثابت ہوتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر اکثر سجدہ فرمایا ہے، اور سجدہ نہ کرنے کی بہ نسبت یہاں سجدہ کرنا بہر حال افضل ہے بلکہ ابن عباس کی تیسری روایت، جو ہم نے اوپر بخاری کے حوالہ سے نقل کی ہے، عدمِ وجوب کی بہ نسبت وجوب کے حکم کا پلڑا جھکا دیتی ہے۔

ایک اور مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں خَرَّ رَاکِعًا (رکوع میں گر پڑا) کے الفاظ استعمال فرماتے ہیں، مگر تمام مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ اس سے مراد خَرَّ سَاجِدًا (سجدہ میں گر پڑا) ہے۔ اسی بنا پر امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب نے یہ رائے ظاہر فرمائی ہے کہ نماز یا غیر نماز میں آیتِ سجدہ سن کر یا پڑھ کر آدمی سجدے کے بجائے صرف رکوع بھی کر سکتا ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے رکوع کا لفظ استعمال کر کے سجدہ مراد لیا ہے تو معلوم ہوا کہ رکوع سجدے کا قائم مقام ہو سکتا ہے۔ فقہائے شافعیہ میں سے امام خطابی کی بھی یہی رائے ہے۔ یہ رائے اگرچہ بجائے خود صحیح اور معقول ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام کے عمل میں ہم کو ایسی کوئی نظیر نہیں ملی کہ آیتِ سجدہ پر سجدہ کرنے کے بجائے رکوع ہی کر لینے پر اکتفا کیا گیا ہو۔ لہٰذا اس رائے پر عمل صرف اُس صورت میں کرنا چاہیے جب سجدہ کرنے میں کوئی امر مانع ہو۔ اسے معمول بنا لینا درست نہیں ہے، اور خود امام ابو حنیفہ اور ان کے اصحاب کا منشا بھی یہ نہیں ہے کہ اسے معمول بنایا جائے، بلکہ وہ صرف اس کے جواز کے قائل ہیں۔

۲۷؎ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت داؤد سے قصور تو ضرور ہوا تھا، اور وہ کوئی ایسا قصور تھا جو دُنبیوں والے مقدمے سے کسی طرح کی مماثلت رکھتا تھا اسی لیے اُس کا فیصلہ سناتے ہوئے معاً

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تجھے زمین میں خلیفہ بنایا ہے، لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً اُن کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے[۲۸]"۔ ع ع۲

ان کو یہ خیال آیا کہ یہ میری آزمائش ہوتی ہے، لیکن اُس قصور کی نوعیت ایسی شدید نہ تھی کہ اسے معاف نہ کیا جاتا، یا اگر معاف کیا بھی جاتا تو وہ اپنے مرتبۂ بلند سے گرا دیئے جاتے۔ اللہ تعالیٰ یہاں خود تصریح فرما رہا ہے کہ جب انہوں نے سجدے میں گر کر توبہ کی تو نہ صرف یہ کہ انہیں معاف کر دیا گیا، بلکہ دنیا اور آخرت میں ان کو جو بلند مقام حاصل تھا اُس میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

۲۸ یہ وہ تنبیہ ہے جو اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کرنے اور بلندیٔ درجات کی بشارت دینے کے ساتھ حضرت داؤد کو فرمائی۔ اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو فعل اُن سے صادر ہوا تھا اُس کے اندر خواہشِ نفس کا کچھ دخل تھا، اُس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا، اور وہ کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرماں روا کو زیب نہ دیتا تھا۔

یہاں پہنچ کر تین سوالات ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اول یہ کہ وہ فعل کیا تھا؟ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو صاف صاف بیان کرنے کے بجائے اِس طرح پردے پردے ہی میں اس کی طرف کیوں اشارہ کیا؟ تیسرے یہ کہ اس سیاق و سباق میں اس کا ذکر کس مناسبت سے کیا گیا ہے؟

جن لوگوں نے بائیبل (عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابِ مقدس) کا مطالعہ کیا ہے ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ اس کتاب میں حضرت داؤد پر اُوریاہ حِتّی (URIAH THE HITTITE) کی بیوی سے زنا کرنے، اور پھر اوریاہ کو ایک جنگ میں قصداً ہلاک کروا کر اُس کی بیوی سے نکاح کر لینے کا صاف صاف الزام لگایا گیا ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہی عورت، جس نے ایک شخص کی بیوی ہوتے ہوئے اپنے آپ کو حضرت داؤد کے حوالہ کیا تھا، حضرت سلیمان علیہ السلام کی ماں تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ پورا قصّہ بائبل کی کتاب سموئیل دوم، باب ۱۱-۱۲ میں نہایت تفصیل کے ساتھ درج ہے نزولِ قرآن سے صدیوں پہلے یہ بائبل میں درج ہو چکا تھا۔ دنیا بھر کے یہودیوں اور عیسائیوں میں سے جو بھی اپنی اس کتابِ مقدس کی تلاوت کرتا، یا اسے سُنتا تھا، وہ اس قصّے سے نہ صرف واقف تھا بلکہ اس پر ایمان بھی لاتا تھا۔ انہی لوگوں کے ذریعہ سے یہ دنیا میں مشہور ہوا اور آج تک حال یہ ہے کہ مغربی ممالک میں بنی اسرائیل اور عبرانی مذہب کی تاریخ پر کوئی کتاب ایسی نہیں لکھی جاتی جس میں حضرت داؤد کے خلاف اِس الزام کو دُہرایا نہ جاتا ہو۔ اس مشہور قصّے میں یہ بات بھی درج ہے کہ :

"خداوند نے ناتن کو داؤد کے پاس بھیجا۔ اُس نے اس کے پاس آکر اس سے کہا کسی شہر میں دو شخص تھے۔ ایک امیر، دوسرا غریب۔ اُس امیر کے پاس بہت سے ریوڑ اور گلّے تھے۔ پر اس غریب کے پاس بھیڑ کی ایک پٹھیا کے سوا کچھ نہ تھا جسے اُس نے خرید کر پالا تھا۔ اور وہ اس کے اور اس کے بال بچّوں کے ساتھ بڑھی تھی۔ وہ اسی کے نوالے میں سے کھاتی اور اس کے پیالہ سے پیتی اور اس کی گود میں سوتی تھی اور اس کے لیے بطور بیٹی کے تھی۔ اور اُس امیر کے ہاں کوئی مسافر آیا سو اس نے اُس مسافر کے لیے، جو اس کے ہاں آیا تھا پکانے کو اپنے ریوڑ اور گلّے میں سے کچھ نہ لیا بلکہ اُس غریب کی بھیڑ لے لی اور اُس شخص کے لیے جو اُس کے ہاں آیا تھا پکائی۔ تب داؤد کا غضب اُس شخص پر بشدّت بھڑکا اور اُس نے ناتن سے کہا کہ خداوند کی حیات کی قسم، وہ شخص جس نے یہ کام کیا واجب القتل ہے۔ اُس شخص کو اس بھیڑ کا چوگنا بھرنا پڑے گا کیونکہ اس نے ایسا کام کیا اور اسے ترس نہ آیا۔ تب ناتن نے داؤد سے کہا کہ وہ شخص تو ہی ہے . . . . تو نے حتّی اوریاہ کو تلوار سے مارا اور اس کی بیوی لے لی تاکہ وہ تیری بیوی بنے اور اس کو بنی عمّون کی تلوار سے قتل کروایا۔" (۲-سموئیل، باب ۱۲- فقرات ۱ تا ۱۱)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس قصّے اور اُس کی اِس شہرت کی موجودگی میں یہ ضرورت باقی نہ تھی کہ قرآن مجید میں اس کے متعلق کوئی تفصیلی بیان دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ کا قاعدہ یہ ہے بھی نہیں کہ وہ اپنی کتابِ پاک میں ایسی باتوں کو کھول کر بیان کرے۔ اس لیے یہاں پردے پردے ہی میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا اور اہلِ کتاب نے اسے بنا کیا دیا ہے۔ اصل واقعہ جو قرآن مجید کے مذکورۂ بالا بیان سے صاف سمجھ میں آتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اوریاہ (یا جو کچھ بھی اُس شخص کا نام رہا ہو) سے محض یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اور چونکہ یہ خواہش ایک عام آدمی کی طرف سے نہیں بلکہ ایک جلیل القدر فرمانروا اور ایک زبردست دینی عظمت رکھنے والی شخصیت کی طرف سے رعایا کے ایک فرد کے سامنے ظاہر کی گئی تھی، اس لیے وہ شخص کسی ظاہری جبر کے بغیر بھی اپنے آپ کو اسے قبول کرنے پر مجبور پا رہا تھا۔ اس موقع پر، قبل اس کے کہ وہ حضرت داؤد کی فرمائش کی تعمیل کرتا، قوم کے دو نیک آدمی اچانک حضرت داؤدؑ کے پاس پہنچ گئے اور انہوں نے ایک فرضی مقدمے کی صورت میں یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ حضرت داؤد ابتداءً میں تو یہ سمجھے کہ یہ واقعی کوئی مقدمہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اسے سن کر اپنا فیصلہ سُنا دیا۔ لیکن زبان سے فیصلہ کے الفاظ نکلتے ہی ان کے ضمیر نے تنبیہ کی کہ یہ تمثیل پوری طرح اُن کے اور اُس شخص کے معاملہ پر چسپاں ہوتی ہے، اور جس فعل کو وہ ظلم قرار دے رہے ہیں اُس کا صدور خود اُن سے اس شخص کے معاملہ میں ہو رہا ہے۔ یہ احساس دل میں پیدا ہوتے ہی وہ سجدے میں گر گئے اور توبہ کی اور اپنے اس فعل سے رجوع فرما لیا۔

بائیبل میں اس واقعہ کی وہ گھناؤنی شکل کیسے بنی؟ یہ بات بھی تھوڑے سے غور کے بعد سمجھ میں آجاتی ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرتِ داؤدؑ کو اُس خاتون کی خوبیوں کا کسی ذریعہ سے علم ہو گیا تھا اور ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا تھا کہ ایسی لائق عورت ایک معمولی افسر کی بیوی ہونے کے بجائے ملک کی ملکہ ہونی چاہیے۔ اسی خیال سے مغلوب ہو کر انہوں نے اس کے شوہر سے یہ خواہش

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ظاہر کی کہ وہ اسے طلاق دے دے۔ اس میں کوئی قباحت انہوں نے اس لیے محسوس نہ کی کہ بنی اسرائیل کے ہاں یہ کوئی معیوب بات نہ سمجھی جاتی تھی۔ اُن کے ہاں یہ ایک معمولی بات تھی کہ ایک شخص اگر کسی کی بیوی کو پسند کرتا تو بے تکلف اس سے درخواست کر دیتا تھا کہ اسے میرے لیے چھوڑ دے۔ ایسی درخواست پر کوئی بُرا نہ مانتا تھا۔ بلکہ بسا اوقات دوست ایک دوسرے کے پاس خاطر سے بیوی کو خود طلاق دے دیتے تھے تاکہ دوسرا اس سے شادی کر لے۔ لیکن یہ بات کرتے وقت حضرت داؤد کو اس امر کا احساس نہ ہُوا کہ ایک عام آدمی کی طرف سے اس طرح کی خواہش کا اظہار تو جبر و ظلم کے عنصر سے خالی ہو سکتا ہے، مگر ایک فرمانروا کی طرف سے جب ایسی خواہش ظاہر کی جاتے تو وہ جبر سے کسی طرح بھی خالی نہیں ہو سکتی۔ اس پہلو کی طرف جب اُس تمثیلی مقدمہ کے ذریعہ سے ان کو توجہ دلائی گئی تو وہ بلا تامل اپنی اس خواہش سے دست بردار ہو گئے اور بات آئی گئی ہو گئی۔ مگر بعد میں کسی وقت جب ان کی کسی خواہش اور کوشش کے بغیر اُس خاتون کا شوہر ایک جنگ میں شہید ہو گیا، اور انہوں نے اس سے نکاح کر لیا، تو یہودیوں کے خبیث ذہن نے افسانہ تراشی شروع کر دی، اور یہ خبثِ نفس اُس وقت اور زیادہ تیزی سے کام کرنے لگا جب بنی اسرائیل کا ایک گروہ حضرت سلیمانؑ کا دشمن ہو گیا (ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۵۸۲)۔ ان محرکات کے زیرِ اثر یہ قصہ تصنیف کر ڈالا گیا کہ حضرت داؤدؑ نے، معاذ اللہ، اوریاہ کی بیوی کو اپنے محل کی چھت پر سے اس حالت میں دیکھ لیا تھا کہ وہ برہنہ نہا رہی تھی۔ انہوں نے اس کو اپنے ہاں بلوا لیا اور اس سے زنا کا ارتکاب کیا جس سے وہ حاملہ ہو گئی۔ پھر انہوں نے اوریاہ کو بنی عمون کے مقابلہ پر جنگ میں بھیج دیا اور فوج کے کمانڈر یوآب کو حکم دیا کہ اسے لڑائی میں ایسی جگہ مقرر کر دے جہاں وہ لازماً مارا جائے۔ اور جب وہ مارا گیا تو انہوں نے اس کی بیوی سے شادی کر لی، اور اسی عورت کے پیٹ سے سلیمان (علیہ السلام) پیدا ہوئے۔ یہ تمام جھوٹے الزامات ظالموں نے اپنی "کتاب مقدس" میں ثبت کر دیئے ہیں تاکہ نسلاً بعد نسلٍ اسے پڑھتے رہیں اور اپنی قوم کے اُن دو بزرگ ترین انسانوں کی تذلیل کرتے رہیں جو حضرت موسیٰ کے بعد ان کے سب سے بڑے محسن تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن مجید کے مفسّرین میں سے ایک گروہ نے تو اُن افسانوں کو قریب قریب جوں کا توں قبول کر لیا ہے جو بنی اسرائیل کے ذریعہ سے ان تک پہنچے ہیں۔ اسرائیلی روایات کا صرف اتنا حصّہ انہوں نے ساقط کیا ہے جس میں حضرت داؤدؑ پر زنا کا الزام لگایا گیا تھا اور عورت کے حاملہ ہو جانے کا ذکر تھا۔ باقی سارا قصّہ اُن کی نقل کردہ روایات میں اسی طرح پایا جاتا ہے جس طرح وہ بنی اسرائیل میں مشہور تھا۔ دوسرے گروہ نے سرے سے اس واقعہ ہی کا انکار کر دیا ہے کہ حضرت داؤدؑ سے کوئی ایسا فعل صادر ہوا تھا جو دُنبیوں والے مقدمہ سے کوئی مماثلت رکھتا ہو۔ اس کے بجائے وہ اپنی طرف سے اس قصّے کی ایسی تاویلات کرتے ہیں جو بالکل بے بنیاد ہیں، جن کا کوئی ماخذ نہیں ہے، اور خود قرآن کے سیاق و سباق سے بھی وہ کوئی مناسبت نہیں رکھتیں۔ لیکن مفسّرین ہی میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جو ٹھیک بات تک پہنچا ہے اور قرآن کے واضح اشارات سے قصّے کی اصل حقیقت پا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چند اقوال ملاحظہ ہوں:

مسروق اور سعید بن جُبیر، دونوں حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ "حضرت داؤدؑ نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا تھا کہ اُس عورت کے شوہر سے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اپنی بیوی کو میرے لیے چھوڑ دے۔" (ابن جریر)

علامہ زمخشری اپنی تفسیر کشّاف میں لکھتے ہیں کہ "جس شکل میں اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کا قصّہ بیان فرمایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اُس شخص سے صرف یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ اُن کے لیے اپنی بیوی کو چھوڑ دے۔"

علامہ ابوبکر جصّاص اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ عورت اس شخص کی منکوحہ نہیں بلکہ صرف مخطوبہ یا منسوبہ تھی، حضرت داؤدؑ نے اسی عورت سے نکاح کا پیغام دے دیا، اس پر اللہ تعالیٰ کا عتاب ہوا کیونکہ انہوں نے اپنے مومن بھائی کے پیغام پر پیغام دیا تھا حالانکہ ان کے گھر میں پہلے سے کئی بیویاں موجود تھیں (احکام القرآن)۔ بعض دوسرے مفسّرین نے بھی یہی رائے ظاہر کی ہے۔ لیکن یہ بات قرآن کے بیان سے پوری مطابقت نہیں رکھتی۔ قرآن مجید میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقدمہ پیش کرنے والے کے جو الفاظ نقل ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ لِي نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا "میرے پاس بس ایک ہی دنبی ہے، اس نے کہا کہ اسے میرے حوالہ کردے"۔ اور یہی بات حضرت داؤد نے اپنے فیصلہ میں بھی ارشاد فرمائی ہے کہ قَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ "اس نے تیری دنبی مانگنے میں تجھ پر ظلم کیا"۔ یہ تمثیل حضرت داؤد کے معاملہ پر اسی صورت میں چسپاں ہو سکتی ہے جبکہ وہ عورت اس شخص کی بیوی ہو۔ پیغام پر پیغام دینے کا معاملہ ہوتا تو پھر تمثیل یوں ہوتی کہ "میں ایک دنبی لینا چاہتا تھا اور اس نے کہا کہ یہ بھی میرے لیے چھوڑ دے"۔

قاضی ابوبکر ابن العربی احکام القرآن میں اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں "اصل واقعہ بس یہی ہے کہ حضرت داؤد نے اپنے آدمیوں میں سے ایک شخص سے کہا کہ میرے لیے اپنی بیوی چھوڑ دے، اور سنجیدگی کے ساتھ یہ مطالبہ کیا۔ . . . قرآن میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ شخص ان کے اس مطالبہ پر اپنی بیوی سے دست بردار ہو گیا اور حضرت داؤد نے اس عورت سے اس کے بعد شادی بھی کر لی اور حضرت سلیمان اسی کے بطن سے پیدا ہوئے . . . جس بات پر عتاب ہوا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انہوں نے ایک عورت کے شوہر سے یہ چاہا کہ وہ ان کی خاطر اسے چھوڑ دے . . . یہ فعل خواہ فی الجملہ جائز ہی ہو مگر منصب نبوت سے بعید تھا، اسی لیے ان پر عتاب بھی ہوا اور ان کو نصیحت بھی کی گئی"۔

یہی تفسیر اس سیاق و سباق سے بھی مناسبت رکھتی ہے جس میں یہ قصہ بیان کیا گیا ہے سلسلۂ کلام پر غور کرنے سے یہ بات صاف معلوم ہوتی ہے کہ قرآن مجید میں اس مقام پر یہ قصہ دو اغراض کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ پہلی غرض نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صبر کی تلقین کرنا ہے اور اس مقصد کے لیے آپ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ "جو باتیں یہ لوگ تم پر بناتے ہیں ان پر صبر کرو، اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کرو"۔ یعنی تمہیں تو ساحر اور کذّاب ہی کہا جا رہا ہے، لیکن ہمارے بندے داؤد پر تو ظالموں نے زنا اور سازشی قتل تک کے الزامات لگا دیئے، لہٰذا ان لوگوں سے جو کچھ بھی تم کو سننا پڑے اسے برداشت کرتے رہو۔ دوسری غرض کفار کو یہ بتانا ہے کہ تم لوگ ہر محاسبے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم نے اس آسمان اور زمین کو، اور اس دنیا کو جو ان کے درمیان ہے، فضول پیدا نہیں

سے بے خوف ہو کر دنیا میں طرح طرح کی زیادتیاں کرتے چلے جاتے ہو، لیکن جس خدا کی خدائی میں تم یہ حرکتیں کر رہے ہو وہ کسی کو بھی محاسبہ کیے بغیر نہیں چھوڑتا، حتیٰ کہ جو بندے اس کے نہایت محبوب و مقرب ہوتے ہیں، وہ بھی اگر ایک ذراسی لغزش کے مرتکب ہو جائیں تو خداوند عالم اُن سے سخت مواخذہ کرتا ہے۔ اس مقصد کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا کہ ان کے سامنے ہمارے بندے داؤد کا قصہ بیان کرو جو ایسی اور ایسی خوبیوں کا مالک تھا، مگر جب اس سے ایک بے جا بات سرزد ہو گئی تو دیکھو کہ ہم نے اسے کس طرح سرزنش کی۔

اس سلسلہ میں ایک غلط فہمی اور باقی رہ جاتی ہے جسے رفع کر دینا ضروری ہے تمثیل میں مقدمہ پیش کرنے والے نے یہ جو کہا ہے کہ اس شخص کے پاس ۹۹ دنبیاں ہیں اور میرے پاس ایک ہی دنبی ہے جسے یہ مانگ رہا ہے، اس سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ شاید حضرت داؤد کے پاس ۹۹ بیویاں تھیں اور وہ ایک اور عورت حاصل کرکے ۱۰۰ کا عدد پورا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دراصل تمثیل کے ہر ہر جزء کا حضرت داؤد اور اوریاہ حتی کے معاملہ پر لفظ بلفظ چسپاں ہونا ضروری نہیں ہے۔ عام محاورے میں دس، بیس، پچاس وغیرہ اعداد کا ذکر صرف کثرت کو بیان کرنے کے لیے کیا جاتا ہے نہ کہ ٹھیک تعداد بیان کرنے کے لیے۔ ہم جب کسی سے کہتے ہیں کہ دس مرتبہ تم سے فلاں بات کہہ دی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دس بار گن کر وہ بات کہی گئی ہے، بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ بارہا وہ بات کہی جا چکی ہے۔ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی ہے تمثیلی مقدمہ میں وہ شخص حضرت داؤد کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ آپ کے پاس متعدد بیویاں ہیں اور پھر بھی آپ دوسرے شخص کی ایک بیوی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہی بات مفسر نیسابوری نے حضرت حسن بصری سے نقل کی ہے کہ لم یکن لداؤد تسع وتسعون امرأۃ وانما ھٰذا مثل "حضرت داؤد کی ۹۹ بیویاں نہ تھیں بلکہ یہ صرف ایک تمثیل ہے۔"

(اس قصے پر تفصیلی بحث ہم نے اپنی کتاب تفہیمات حصہ دوم میں کی ہے۔ جو اصحاب ہماری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر دیا ہے

کر دیا ہے؟ ۹ یہ تو اُن لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا ہے، اور ایسے کافروں کے لیے

بیان کردہ تاویل کی ترجیح کے مفصل دلائل معلوم کرنا چاہتے ہیں وہ اس کتاب کے صفحات ۲۹ تا ۴۴ ملاحظہ فرمائیں)

۲۹ یعنی محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کر دیا ہے کہ اس میں کوئی حکمت نہ ہو، کوئی غرض اور مقصد نہ ہو، کوئی عدل اور انصاف نہ ہو، اور کسی اچھے یا بُرے فعل کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو۔ یہ ارشاد پچھلی تقریر کا ماحصل بھی ہے اور آگے کے مضمون کی تمہید بھی۔ پچھلی تقریر کے بعد یہ فقرہ ارشاد فرمانے سے مقصود یہ حقیقت سامعین کے ذہن نشین کرانا ہے کہ انسان یہاں شترِ بے مہار کی طرح نہیں چھوڑ دیا گیا ہے، نہ یہ دنیا اندھیر نگری ہے کہ یہاں جس کا جو کچھ جی چاہے کرتا رہے اور اُس پر کوئی باز پُرس نہ ہو۔ آگے کے مضمون کی تمہید کے طور پر اس فقرے سے کلام کا آغاز کر کے یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جو شخص جزا و سزا کا قائل نہیں ہے اور اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ نیک و بد سب آخر کار مر کر مٹی ہو جائیں گے، کسی سے کوئی محاسبہ نہ ہوگا، نہ کسی کو بھلائی یا برائی کا کوئی بدلہ ملے گا، وہ دراصل دنیا کو ایک کھلونا اور اس کے بنانے والے کو کھلنڈرا سمجھتا ہے اور اس کا خیال یہ ہے کہ خالقِ کائنات نے دنیا بنا کر اور اس میں انسان کو پیدا کر کے ایک فعلِ عبث کا ارتکاب کیا ہے۔ یہی بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف طریقوں سے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ مثلاً فرمایا:

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّ اَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ (المومنون:۱۱۵)	کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم نے تم کو فضول پیدا کر دیا ہے اور تم ہماری طرف پلٹائے جانے والے نہیں ہو؟
وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۔	ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور اس کائنات کو جو ان کے درمیان ہے کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا ہے۔ ہم نے ان کو برحق پیدا کیا ہے مگر اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔
اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ	درحقیقت فیصلے کا دن ان سب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بربادی ہے جہنم کی آگ سے۔ کیا ہم اُن لوگوں کو جو ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں اور اُن کو جو زمین میں فساد کرنے والے ہیں یکساں کر دیں؟ کیا متقیوں کو ہم فاجروں جیسا کر دیں ۳۰؎؟ ـــــ یہ ایک بڑی برکت والی کتاب ہے ۳۱؎ جو (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ یہ لوگ اس کی آیات پر غور کریں اور عقل و فکر رکھنے والے اس سے سبق لیں۔

(الدخان : ۳۸ - ۴۰) کے لیے حاضری کا وقت مقرر ہے۔

۳۰؎ یعنی کیا تمہارے نزدیک یہ بات معقول ہے کہ نیک اور بد دونوں آخر کار یکساں ہو جائیں؟ کیا یہ تصور تمہارے لیے اطمینان بخش ہے کہ کسی نیک انسان کو اس کی نیکی کا کوئی صلہ اور کسی بد آدمی کو اس کی بدی کا کوئی بدلہ نہ ملے؟ ظاہر بات ہے کہ اگر آخرت نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی محاسبہ نہ ہو اور انسانی افعال کی کوئی جزا و سزا نہ ہو تو اس سے اللہ کی حکمت اور اس کے عدل، دونوں کی نفی ہو جاتی ہے اور کائنات کا پورا نظام ایک اندھا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔ اس مفروضے پر تو دنیا میں بھلائی کے لیے کوئی محرک اور برائی سے روکنے کے لیے کوئی مانع سرے سے باقی ہی نہیں رہ جاتا۔ خدا کی خدائی اگر معاذ اللہ ایسی ہی اندھیر نگری ہو تو پھر وہ شخص بے وقوف ہے جو اس زمین پر تکلیفیں اٹھا کر خود صالح زندگی بسر کرتا ہے اور خلقِ خدا کی اصلاح کے لیے کام کرتا ہے، اور وہ شخص عقلمند ہے جو سازگار مواقع پا کر ہر طرح کی زیادتیوں سے فائدے سمیٹتا اور ہر قسم کے فسق و فجور سے لطف اندوز ہوتا ہے۔

۳۱؎ برکت کے لغوی معنی ہیں "افزائشِ خیر و سعادت"۔ قرآن مجید کو برکت والی کتاب کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ انسان کے لیے نہایت مفید کتاب ہے، اس کی زندگی کو درست کرنے کے لیے بہترین ہدایات دیتی ہے، اس کی پیروی میں آدمی کا نفع ہی نفع ہے، نقصان کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com